

تفسیر القرآن الفکر

(۳)

رحمان کے داخلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو
 اللہ یعنی جس رحمان کو سجدہ کرنے کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے اور تم اس سے انحراف کر رہے ہو اس کے
 پیدا نشی بندے تو سب ہی ہیں، مگر اس کے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو شعوری طور پر بندگی اختیار کر کے
 یہ اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سجدہ جس کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے، اُس کے نتائج
 یہ ہیں جو اس کی بندگی قبول کرنے والوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں، اور اس سے انکار کے نتائج وہ ہیں جو تم لوگوں
 کی زندگی میں عیاں ہیں۔ اس مقام پر اصل مقصود سیرت و اخلاق کے دونوںوں کا تقابل ہے، ایک وہ نمونہ
 جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں میں پیدا ہو رہا تھا، اور دوسرا وہ جو جاہلیت پر جسے ہو لوگوں
 میں ہر طرف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس تقابل کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ صرف پہلے نمونہ کی نمایاں خصوصیات
 کو سامنے رکھ دیا، اور دوسرے نمونے کو ہر دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن پر چھوڑ دیا کہ وہ آپ ہی تقابل
 کی تصویر کو دیکھے اور آپ ہی دونوں کا موازنہ کرے۔ اُس کے بیان کی حاجت نہ تھی، کیونکہ وہ گروہ پیش سارے
 معاشرے میں موجود تھا۔

یعنی تکبر کے ساتھ اڑنے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جیسا کہ اللہ مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا
 زور جتانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اُن کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی
 ہے۔ نرم چال سے مراد ضعیفانہ اور مرصیانہ چال نہیں ہے، اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریاکار آدمی اپنے
 انکار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنع سے اختیار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کہتے ہیں خود اس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف آ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے منقول روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے ایک جوان آدمی کو فریل چاں چلتے دیکھا تو روک کر پوچھا کیا تم بیمار ہو۔ اس نے عرض کیا نہیں اپنے ذمہ اٹھا کر اسے دھکا یا ادب سے قوت کے ساتھ چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے نہ کہ وہ جو بناوٹ سے منکسرانہ بنائی گئی ہو یا جس سے خواہ مخواہ کی مسکنت اور ضعیفی ٹپکتی ہو۔

مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گنتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بد معاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند تکبر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر باسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور علیم اور پیر و لوگ ہیں، ان کے کسی شر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۵۵ جاہل سے مراد ان پڑھ یا بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو جوہر الہی پر اترا آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمان کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور اسی طرح کی ہر بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے بلکہ جوان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: **وَإِذَا مَجَعُوا اللَّغْوَ أَخْرَجْنَا عَنْهُمُ** **قَوْلًا نَّانَا أَعْمَانَا وَ لَكُمْ أَعْمَانُكُمْ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، لَا تَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ**۔ اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کرتے ہیں، کہتے ہیں بھائی ہمارے اعمال ہمارے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے سلام ہے

کہ "اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچا لے، اُس کا عذاب تو جان کا آگاہ ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا
مستقر اور متعام ہے" جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ وہ لوگوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں
تم کو، ہم جاہلوں کے مزہ نہیں گئے" (المقصود - رکوع ۶)۔

۱۵۷ یعنی وہ اُن کے دن کی زندگی تھی اور یہ ان کی راتوں کی زندگی ہے۔ ان کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں، نہ
ناچ گانے میں، نہ لہو و لعب میں، نہ گھبروں اور افسانہ گوئیوں میں، اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت
کے ان معروف مشاغل کے برعکس یہ اس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حضور کھڑے اور بیٹھے اور بیٹھے
دعا و عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً
سورہ سجدہ میں فرمایا تَتَجَانَفُ اُجُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا، ان کی پیٹھیں بستروں
اُگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں" (رکوع ۲)۔ اور سورہ ذاریات میں فرمایا کَاوُفًا
تَبِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْآسْحَارِ هُمْ سَاهِبُونَ، یہ اہل حینت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے
تھے اور سحر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے (رکوع ۱)۔ اور سورہ زمر میں ارشاد ہُوَ اَمَّنْ هُوَ
قَابِتٌ اِنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَامًا يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِ، وہ کیا اس شخص کا انجام کسی مشرک
جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرمانبردار ہو، رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو
اور اپنے رب کی رحمت کی اُس لگائے ہوئے ہو؟ (رکوع ۱)۔

۱۵۸ یعنی یہ عبادت اُن میں کوئی غرور پیدا نہیں کرتی۔ انہیں اس بات کا کوئی زعم نہیں ہوتا کہ ہم تو اللہ کے پیارے
اور اس کے چہیتے ہیں، جیسا اگ بھی کہاں چھو سکتی ہے۔ بلکہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود وہ اس خوف
سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے عمل کی کوتاہیاں ہم کو قبلاٹے عذاب نہ کر دیں۔ وہ اپنے تقویٰ کے زور سے
حینت جیت لینے کا پندار نہیں رکھتے، بلکہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اقرار کرتے ہوئے عذاب سے بچنے کیلئے ہی کو
غنیمت سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے بھی ان کا اعتماد اپنے عمل پر نہیں بلکہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

۱۵۹ یعنی نہ تو ان کا حال یہ ہے کہ عیاشی اور قمار بازی، اور شراب نوشی، اور یارباشی، اور میلوں ٹھیلوں، اور شادی
بیاہ میں بے دریغ روپیہ خرچ کریں اور اپنی حینیت سے بڑھ کر اپنی شان دکھانے کے لیے غذا، مکان، لباس اور

جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ
زنا کے ترکیب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا قیامت کے روز

ترکین و آرائش پر دولت ٹمائیں۔ اور نہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک ندر پرست آدمی کی طرح پیسہ جو ہر جگہ رکھیں نہ
خود کھائیں، نہ بال بچوں کی ضروریات اپنی استطاعت کے مطابق پھینکیں، اور نہ کسی راہ خیر میں خوش دلی کے ساتھ
کچھ دیں۔ عرب میں یہ دونوں قسم کے نمونے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو خوب دل
کھول کر خرچ کرتے تھے، مگر ان کے ہر خرچ کا مقصود یا تو ذاتی عیش و تنعم تھا، یا برادری میں ناک اور بچی رکھنا اور اپنی
فیاضی و دولت مندی کے دکھانے کا۔ دوسری طرف وہ کھیل تھے جن کی کجروی مشہور تھی۔ اعتدال کی روش بہت سی
کم لوگوں میں پائی جاتی تھی اور ان کم لوگوں میں اس وقت سب سے زیادہ نمایاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
اس موقع پر پہچان لینا چاہیے کہ اسراف کیا چیز ہے اور بخل کیا چیز۔ اسلامی نقطہ نظر سے اسراف تین چیزوں
کا نام ہے۔ ایک۔ ناجائز کاموں میں دولت صرف کرنا، خواہ وہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے۔ جائز کاموں
میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر جانا۔ خواہ اس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے
زیادہ خرچ کرے، یا اس لحاظ سے کہ آدمی کو جو دولت اس کی ضرورت سے بہت زیادہ
ملی ہو اسے وہ اپنے ہی عیش اور ٹھاٹھ باٹھ میں صرف کرتا چلا جائے۔ تیسرے نبی کے کاموں میں خرچ کرنا
مگر اللہ کے لیے نہیں بلکہ ریا اور نمائش کے لیے۔ اس کے برعکس بخل کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی
اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی مقدرت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ نیکی اور
جہاد کے کاموں میں اس کے ہاتھ سے پیسہ نہ نکلے۔ ان دونوں اہتماموں کے درمیان اعتدال کی راہ اسلام کی راہ
ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ من فقه الرجل تصدق فی معیشتہ، اپنی معیشت میں تو سب
اختیار کرنا آدمی کے فقیر (دانا) ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔ (زا احمد و طبرانی، برہان ص ۱۰۰)۔

۱۱۔ یعنی وہ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جن میں اہل عرب کثرت سے مبتلا ہیں۔ ایک شرک باللہ
دوسرے قتل ناحق۔ تیسرے زنا۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً
عبدالرحمن مسعودی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے فرمایا ان تجعل

لله نداء وهو خلقك ؟ یہ کہ تو کسی کو اللہ کا مد مقابل اور ہمسر ٹھہرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے۔ پوچھا گیا اس کے بعد: فرمایا ان تقتل ولدك خشية ان يطعوك معك ؟ یہ کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔ پوچھا گیا پھر: فرمایا ان تزاني حليلة جارك، یہ کہ تو اپنے ہمسلے کی بیوی سے زنا کرے (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد)۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں، لیکن عرب کی سوسائٹی پر اس وقت سب سے زیادہ تسلط انہی تین گناہوں کا تھا، اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں یہ چند لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بچ گئے ہیں۔

یہاں یہ سہل کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین کے نزدیک تو شرک سے پرہیز کرنا ایک بہت بڑا عیب تھا پھر اسے سزاؤں کی ایک خوبی کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش کرنے کی کونسی معقول وجہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصب کی حد تک جلتا تھے، مگر وہ حقیقت اس کی جڑیں اوپری سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری آزی ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری آزی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں دبی ہوئی موجود تھی جس کو ابھارنے کے لیے اوپر کی سطح کو بس نسا زدہ سے کھرچ دینے کی ضرورت تھی۔ جاہلیت کی تاریخ کے متعدد واقعات ان دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً ابرہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ مبت نہیں ٹال سکتے جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی نیا ہی پر ہم عصر شعراء نے کہے تھے۔ ان کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اس میں ان کے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکین عرب کے سامنے آیا تھا کہ ابرہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہل طائف نے اس اندیشے سے کہ یہ کہیں ان کے معبودوں کی بات ہے کہ مندر کو بھی نہ گرا دے، اپنی خدمات کیسے کو منہدم کرنے کے لیے اس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بدوتے اس کے ساتھ کر دیئے تاکہ وہ پیاری راستوں سے اس لشکر کو بخیریت مکہ تک پہنچادیں۔ اس واقعہ کی تاریخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور ساہا سال تک وہ اس شخص کی قبر پر ننگ باری

کرتے رہے جو طائف کے بدرتے کا سردار تھا۔ علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہل عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور خصوصاً مناسک حج کو دین ابراہیمی ہی کے اجراء قرار دیتے تھے، اور یہ بھی ملتے تھے کہ حضرت ابراہیم خالص خدا پرست تھے، تمہوں کی پرستش انہوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی روایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بت پرستی ان کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بت کب، کہاں سے، کون لایا، اپنے معبودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آجاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر داتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذوالنخلصہ نامی بت کے آستانے پر جا کر اس نے فال لھوائی جو اب نکلا: یہ کام نہ کیا جائے۔ اس پر عرب طیش میں آگیا کہنے لگا:

لو كنت يا ذوالنخلصہ الموقورا
مثلي وكان شيخك المقبوراً

لعمرك عن قتل العداة زورا

یعنی اے ذوالنخلصہ، اگر میری جگہ تو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو میرے گز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔ ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلہ اپنے معبود سعد نامی کے آستانے پر لگنے والا بن کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا ٹرنکابت تھا جس پر قربانیوں کا خون تھرا ہوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر ٹھکر گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح بت پرست ہونے دیکھ کر غصے میں آگیا۔ بت پرستہ مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رجبے سے لوط بھی بھاگادیئے یہ متعدد بت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے۔ مثلاً آساف اور نائلہ جن کے مجسمے صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت کے ایک مرد تھے جنہوں نے خانہ کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبودوں کی ہوا ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دل میں نہیں ہو سکتی۔ ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات باسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قد و منزلت تو دلوں میں موجود تھی، مگر ایک

اُس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الایہ کہ کوئی ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا ہو اور ایمان لاکر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے

حرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا، اور دوسری طرف قریش کے پرہیزگاری کے خلاف تعصب انتہائی بھڑکتے رہتے تھے، کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آجائے گا۔ ان سپاہیوں پر جو مذہبِ شرک قائم تھا وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی ذنار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بتے تکلف کہا کہ تمہارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہیے مشرکین تیار نہ ہوں، مگر دلوں میں اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔

۵۵ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عذاب کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے گا، بلکہ پے درپے جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کفر یا شرک یا دہریت والہماؤ کے ساتھ قتل اور زنا اور دوسری معصیتوں کا بوجھ لیے ہوئے جائیگا اُس کو بغاوت کی سزا الگ ملے گی اور ایک ایک جرم کی سزا الگ ملے گی۔ اس کا ہر چھوٹا بڑا تصور حساب میں آئے گا۔ کوئی ایک خطا بھی معاف نہ ہوگی۔ قتل کی سزا ایک نہیں ہوگی بلکہ ہر فعلِ قتل کی الگ سزا اس کو بھگتنی ہوگی۔ زنا کی سزا بھی ایک نہیں ہوگی بلکہ خنثی بارود اس جرم کا ترکیب تھا ہے اس کی جدا گانہ سزا پائے گا۔ اسی لیے حال دوسرے تمام جرائم اور معاصی کے معاملے میں یہ بھی ہوگا۔

۵۶ یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ یہی عام معافی (GENERAL AMNESTY) کا اعلان تھا جس نے اس بڑے بڑے معاشرے کے لاکھوں افراد کو سہارا دے کر مستقل بگاڑ سے بچایا۔ اسی نے ان کو امید کی روشنی دکھائی اور اصلاح حال پر آمادہ کیا۔ ورنہ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو ان کی سزا سے اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، تو یہ انہیں مایوس کر کے ہمیشہ کے لیے بدی کے گھنموں میں پھنسا دیتا اور کبھی ان کی اصلاح نہ ہو سکتی۔ مجرم انسان کو صرف معافی کی امید ہی جرم کے چکر سے نکال سکتی ہے۔ مایوس ہو کر وہ ابلیس بن جاتا ہے۔

بدل دیکھا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص تو بہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف سے

تو بہ کی اس نعمت نے عرب کے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا، اس کا اندازہ ان بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو جسے ابن جریر و طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مسجد نبوی سے عشا کی نماز پڑھا کر ٹپا کر دیکھا کہ ایک عورت میرے دروازے پر کھڑی ہے۔ میں اس کو سلام کر کے اپنے حجرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے نوافل پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھا کیا چاہتی ہے۔ وہ کہنے لگی میں آپ سے ایک سوال کی تھائی ہوں۔ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا۔ ناجائز حمل ہوا۔ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے مار ڈالا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ معاف ہونے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ کہا ہرگز نہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ آہیں بھرتی ہوئی واپس چلی گئی، اور کہنے لگی۔ افسوس، یہ حسن آگ کے لیے پیدا ہوا تھا۔ صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ کر جب میں خارج ہوا تو میں نے حضور کو رات کا قصہ سنایا۔ آپ نے فرمایا، بڑا غلط جواب دیا ابو ہریرہ تم نے، کیا یہ آیت قرآن میں تم نے نہیں پڑھی وَالَّذِينَ تَلَايُدُّعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ... . . . بِالْأَمْنِ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا؛ حضور کا یہ جواب سن کر میں نکلا اور اس عورت کو تلاش کرنا شروع کیا۔ رات کو عشا ہی کے وقت وہ ملی۔ میں نے اسے بشارت دی اور بتایا کہ سرکارِ رسالتاب نے تیرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ وہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی شکر ہے اس خدا پاک کا جس نے میرے لیے معافی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے گناہ سے توبہ کی اور اپنی لونڈی کو اس کے بیٹے سمیت آزاد کر دیا۔ اسی سے ملتا جلتا واقعہ احادیث میں ایک پڑھے کا آیا ہے جس نے آکر حضور سے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ساری زندگی گناہوں میں گزری ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا ارتکاب نہ کر چکا ہوں اپنے گناہ تمام دوسے زمین کے باشندوں پر بھی تقسیم کر دوں تو سب کو سے ڈوب میں کیا اب بھی میری معافی کی کوئی صورت ہے؟ فرمایا، کیا تو نے اسلام قبول کر لیا ہے؟ اس نے عرض کیا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ فرمایا جا، اللہ معاف کرنے والا ہے اور تیری برائیوں کو بھلائی سے بدل دینے والا ہے۔ اس نے عرض کیا میرے سارے جرم اور قصود؟ فرمایا، ہاں، تیرے سارے جرم اور قصود (ابن کثیر رحمہ اللہ ابن ابی حاتم

آتا ہے جو پلٹنے کی اصل جگہ ہے۔ اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔

۷۵۵ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ تو بہ کر لے لے کہ تو کفر کی زندگی میں جو بُرے افعال وہ پہلے کیا کرتے تھے ان کی جگہ اب طاعت اور ایمان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیک افعال کرنے لگیں گے اور تمام برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ دوسرے یہ کہ تو بہ کے نتیجے میں صرف اتنا ہی نہ ہو گا کہ ان کے نامہ اعمال سے وہ تمام قصور کاٹ دیئے جائیں گے جو انہوں نے کفر و گناہ کی زندگی میں کیے تھے، بلکہ ان کی جگہ ہر ایک کے نامہ اعمال میں یہ نیکی لکھی جائے گی کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے بغاوت اور نافرمانی کو چھوڑ کر طاعت و فرمانبرداری اختیار کر لی۔ پھر جتنی بار بھی وہ اپنی سابقہ زندگی کے بُرے اعمال کو یاد کر کے نادام ہوتا ہو گا اور اس نے اپنے خدا سے استغفار کیا ہو گا، اس کے حساب میں اتنی ہی نیکیاں لکھ دی جائیں گی، کیونکہ خطا پر شرمسار ہونا اور معافی مانگنا بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس طرح اس کے نامہ اعمال میں تمام پھلی برائیاں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ اور اس کا انجام صرف سزا سے بچ جانے ہی تک محدود نہ رہے گا بلکہ وہ اٹا انعامات سے سرفراز ہو گا۔

۷۵۶ یعنی فطرت کے اعتبار سے بھی بندے کا اصلی مرجع اسی کی بارگاہ ہے، اور اخلاقی حیثیت سے بھی وہی ایک بارگاہ ہے جس کی طرف اسے پلٹنا چاہیے، اور نتیجے کے اعتبار سے بھی اسی بارگاہ کی طرف پلٹنا مفید ہے مدد کوئی دوسری جگہ ایسی نہیں ہے جو صبر و جوع کر کے وہ سزا سے بچ سکے یا ثواب پاسکے۔ علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ پلٹ کر ایک ایسی بارگاہ کی طرف جاتا ہے جو واقعی ہے ہی پلٹنے کے قابل جگہ، بہترین بارگاہ جہاں سے تمام بھلائیاں ملتی ہیں، جہاں سے قصوروں پر شرمسار ہونے والے دھمکارے نہیں جاتے بلکہ معافی اور انعام سے نوازے جاتے ہیں، جہاں معافی مانگنے والے کے جرم نہیں گنے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے تو بہ کر کے اپنی اصلاح کتنی کر لی، جہاں بندے کو وہ آقا مٹا ہے جو انتقام پر غماز کھٹے نہیں مٹھا ہے بلکہ اپنے ہر شرمسار غلام کے لیے دامن رحمت کھولے ہوئے ہے۔

۷۵۷ اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے اور کسی ایسی چیز کو واقعہ اور حقیقت قرار نہیں دیتے جس کے واقعہ اور حقیقت ہونے کا انہیں علم نہ ہو، یا جس کے خلاف واقعہ و حقیقت ہونے کا انہیں اطمینان ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے۔

اور کسی لغوی چیز پر ان کا گزرا ہوا ہے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دعائیں مانگا

اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس دوسرے مطلب کے اعتبار سے "جھوٹ" کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنی ہے۔ انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا ہے، لذت یا خوشنمائی یا ظاہری فائدے کے اس جھوٹے طمع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ طمع اتر جائے تو ہر بدی سر امر کھوٹ ہی کھوٹ ہے جس پر انسان کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ لہذا ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی اس لحاظ سے جھوٹ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی چمک و مکسکی وجہ سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے۔ مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، اس لیے وہ اس جھوٹ کو ہر روپ میں پہچان جاتا ہے، خواہ وہ کیسے ہی دلفریب و لائل، یا نعر فریب آرٹ، یا سماعت فریب خوش آواز لیل کا جامہ پہن کر آئے۔

۹۰ "لغو" کا لفظ آج جھوٹ پر بھی حاوی ہے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، اور اس کے ساتھ تمام فضول، بلا یعنی اور بے فائدہ باتیں اور کام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اللہ کے صالح بندوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اس طرح کی چیزیں دیکھنے یا سننے یا ان میں حصہ لینے کے لیے نہیں جاتے، اور اگر کبھی ان کے راستے میں ایسی کوئی چیز آجائے تو ایک لگاؤ غلط انداز تک ڈالے بغیر اس پر سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے ایک نفیس مزاج آدمی گندگی کے ڈیرے سے گزر جاتا ہے۔ غلاظت اور تعفن سے دلچسپی ایک بندوق اور ہلید آدمی تو لے سکتا ہے مگر ایک خوش ذوق اور مہذب انسان مجبوری کے بغیر اس کے پاس سے بھی گزرنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ بدبو سے مستفید ہونے کے لیے ایک سانس بھی وہاں لے۔

۹۱ اصل میں الفاظ ہیں لَعُوٌّ يَخْتَرِقُ عَلَيْهَا صَمًا وَ مُمِيًا نَا، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے۔" لیکن یہاں گرنے کا لفظ اپنے لغوی معنی کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہم آدو میں کہتے ہیں: "جہاد کا حکم سن کر بیٹھے رہ گئے۔" اس میں بیٹھنے کا لفظ اپنے لغوی معنی میں نہیں بلکہ جہاد کے لیے حرکت نہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ٹس سے مس نہ ہوں، بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایت ان آیت

کہتے ہیں کہ اُسے پناہ سے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے گا اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا دے گا۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے ظہیر کا پھل مندرجہ ذیل شکل میں پائیں گے۔

۹۱ میں آئی ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں، جس چیز کو فرض قرار دیا گیا ہو اُسے بحالات میں، جس چیز کی مذمت بیان کی گئی ہو اُس سے رُک جاتے ہیں، اور جس عذاب سے ڈرایا گیا ہو اُس کے تصور سے کانپ اُٹھتے ہیں۔

۹۲ یعنی اُن کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دے اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر۔ کیونکہ ایک مومن کو بیوی بچوں کے حسن و جمال اور عیش و آرام سے نہیں بلکہ ان کی نیک خصال سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہو سکتی کہ جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ پیارے ہیں انہیں رنج کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے دیکھے۔ ایسی صورت ہو تو بیوی کا حسن اور بچوں کی جوانی و لیاقت اُس کے لیے اور بھی زیادہ سوچا جانے لگی، کیونکہ وہ ہر وقت اس رنج میں مبتلا رہے گا کہ یہ سب اپنی ان خوبیوں کے باوجود اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں۔

یہاں خاص طور پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہ وقت وہ تھا جبکہ مکہ کے مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے محبوب ترین رشتہ دار کفر و جاہلیت میں مبتلا نہ ہوں۔ کوئی مرد ایمان لے آیا تھا تو اس کی بیوی ابھی کافر تھی کوئی عورت ایمان لے آئی تھی تو اس کا شوہر ابھی کافر تھا۔ کوئی نوجوان ایمان لے آیا تھا تو اس کے ماں باپ اور بھائی بہن سب کے سب کفر میں مبتلا تھے۔ اور کوئی باپ ایمان لے آیا تھا تو اس کے اپنے جوان جہان بچے کفر پر قائم تھے اس حالت میں ہر مسلمان ایک شدید روحانی اذیت میں مبتلا تھا اور اس کے دل سے وہ دعا نکلتی تھی جس کی بہترین ترجمانی اس آیت میں کی گئی ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک نے اس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے کہ اپنے پیاروں کو کفر و جاہلیت میں مبتلا دیکھ کر ایک آدمی کو ایسی اذیت ہو ہی ہے جیسے اس کی آنکھیں آشوبِ چشم سے ابل آئی ہوں اور کھٹک سے سوٹیاں سی چھو رہی ہوں یا اس سلسلہ کلام میں ان کی اس کیفیت کو دراصل یہ بتانے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس دین پر ایمان لائے ہیں پورے خلوص کے ساتھ لائے ہیں۔ ان کی حالت اُن لوگوں کی سی نہیں ہے جن کے خاندان کے لوگ مختلف مذہبوں اور پارٹیوں میں شامل رہتے ہیں اور سب مطمئن رہتے ہیں کہ چلو، ہر بیک میں سہارا کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔

آداب و تسلیات سے ان کا استقبال ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے کیا ہی اچھا ہے وہ منقہ اور وہ مقام۔

اے محمد، لوگوں سے کہو کہ میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلایا ہے عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی یہ

۱۹۹ یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھیا میں، جھٹلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں، محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت و شہرت میں نہیں بلکہ نیکی و پاکیزگی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کچھ اللہ کے بندے دنیا میں ایسے ہیں جنہوں نے اس آیت کو بھی امانت کی امیدواری اور ریاست کی طلب کے لیے دلیل جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ آج کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ متقی لوگوں کو ہماری رعیت، اور ہم کو ان کا حکمراں بنا دے۔" اس سخن فہمی کی داؤد امیدواروں کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔

۱۹۹ صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنان حق کے مظالم کو مروا لگی کے ساتھ برعادت کرنا۔ دین حق کو قائم اور سر بلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو بہہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر ثابت قدم رہنا۔ فیصلہ دہی تمام تر غیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجالانا اور حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو اٹین کر جانا۔ عرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

۱۹۹ اصل میں لفظ عرفہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی بند و بلا عمارت کے ہیں اس کا ترجمہ عام طور پر "بلاخانہ" کیا جاتا ہے جس سے آدمی کے ذہن میں ایک وہ منزلہ کوٹھے کی سی تصویر آجاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، غرضی کہ ہندوستان کا روضہ تاج

اور امریکہ کے "فلک شگاف" (SKY SCRAPERS) تک جنت کے ان عملات کی محض ایک
 بھونڈی نقل میں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولادِ آدم کے لاشعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔
 ۱۹۷۰ء یعنی اگر تم اللہ سے دعائیں نہ مانگو، اور اس کی عبادت نہ کرو، اور اپنی حاجات کے لیے اس کے
 مدد کے لیے نہ پکارو، تو پھر تمہارا کوئی فن بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ پرہیزگار
 کے برابر بھی تمہاری پرعا کرے۔ محض مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں۔ تم سے
 اللہ کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ تم بندگی نہ کرو گے تو اس کا کوئی کام رکاوٹ نہ جائے گا۔ اس کی نگاہ
 انفتحات کو جو چیز تمہاری طرف مائل کرتی ہے وہ تمہارا اس کی طرف ہاتھ پھیلا نا اور اس سے دعائیں مانگنا
 ہی ہے۔ یہ کام نہ کرو گے تو کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیئے جاؤ گے۔